بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

۱۰۹۷ء میں مشرق قریب کے اسلامی ملکوں پر یورپ سے صلیبی حملے شروع ہوتے ہیں، جن کا سلسلہ کوئی دو سو سال تک رہا۔ اُس وقت یورپ جہالت، درندگی اور مذہبی تعصب کی آخری حد پر تھا۔ چنانچہ صلیبی حملہ آوروں کے ریلے کے ریلے جب ان اسلامی ملکوں میں پہنچے، جو اُس عہد میں بڑے متمدن اور ترقی یافتہ تھے، اور جن کے شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں مدارس اور کتب خانے قائم تھے، تو نہ صرف اِن ملکوں کے سرسبز و آباد علاقے ویران ہو گئے بلکہ گزشتہ چار پانچ سو سال میں علوم و فنون اور تہذیب و تمدن میں یہاں جو ترقیاں ہوئی تھیں، اُن کا سارا اثاثہ ان وحشی اور خون خوار صلیبیوں کی نذر ہو گیا۔ آخر میں مسلمان اپنی سرزمین سے ان یورپی غارت گروں کو نکالنے میں بے شک کامیاب ہو گئے لیکن وسط ایشیا سے آنے والے جن ترکمانوں کی مدد سے یہ کارنامہ سرانجام پایا بعد میں اُن کی حکومت کے طویل دَور میں نہ تو اسلامی تہذیب کو نمو ملا اور نہ علوم و فنون کی اُجڑی ہوئی محفلیں دوبارہ آباد ہوئیں۔ مسلمانوں کی علمی زندگی برابر سمٹتی چلی گئی۔ اور اُن کا ذہنی اُفق محدود سے محدود تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۷۹۸ء میں نپولین مصر پر حملہ کرتا ہے۔ اور اس علاقے کے مسلمان پہلی دفعہ جانتے ہیں کہ وہ زوال کی کس عمیق و تاریک غار میں ہیں، اور یورپ ترقی کر کے کہاں پہنچ گیا ہے۔

صلیبی حملے ختم ہوئے ہی تھے کہ ۱۲۱۸ء کے قریب چنگیز خان اپنی لکھوکھا فوج کے ساتھ منگولیا سے نکل کر وسط ایشیا کا رُخ کرتا ہے۔ یہ علاقے جن سے آج افغانستان، ایران اور سوویت یونین کی ترک ریاستیں عبارت ہیں، اُس زمانے میں بڑے آباد تھے، اور ایک ایک

شہر کی آبادی کئی کئی لاکھ تھی۔ تاتاریوں نے شہروں کو جلایا۔ باشندوں کو بے دریغ قتل کیا۔ اور اس کے ساتھ علوم و فنون کے ذخیرے بھی بھسم کر ڈالے۔ ۱۲۵۸ء میں ہلاکو خان نے بغداد فتح کیا اور ابن خلدون نے لکھا ہے کہ اُس کے بیس لاکھ باشندوں میں سے صرف چار لاکھ زندہ بچ سکے۔ اور کتب خانوں، مدارس اور تہذیب و تمدن کا جو نقصان ہوا، اُس کا تو کوئی حساب نہیں۔ سید امیر علی کے الفاظ میں بغداد کے ساتھ پانچ صدیوں کی جمع شدہ علمی متاع ہمیشہ کے لئے نابود ہو گئی اور وہ طبقے جو قوم کا نچوڑ تھے، وہ مٹ گئے۔ تاتاریوں کا یہ سیل صرف یہیں تک نہیں رُکا۔ بلکہ شام بھی اُس کی لپیٹ میں آگیا اور صرف حلب کے شہر میں پچاس ہزار مسلمانوں کو تاتاریوں نے تہ تیغ کیا۔ اتفاق سے مصر اس تباہی سے بچ گیا۔ لیکن وہاں کے مملوک حکمرانوں کا دور اسلامی تہذیب کو کوئی سنبھالا نہ دے سکا۔

سمرقند و بخارا سے لے کر حلب و دمشق تک کے یہ سارے ملک تاتاریوں کے پاؤں تلے اِس بُری طرح روندے جانے کے بعد کیسے اُٹھ سکتے تھے۔ مصر کی حالت بھی ممالیک نے کچھ ایسی ہی بنا دی تھی۔ بے شک اس کے بعد برصغیر پاک و ہند میں مغل، ایران میں صفوی اور استنبول میں عثمانی ترک برسرِ اقتدار آئے، اور اُنھوں نے بڑی شان دار سلطنتیں قائم کیں، لیکن صلیبی اور تاتاری حملہ آوروں کے ہاتھوں مسلمانوں کا جس وسیع پیمانے پر جانی، مالی، تہذیبی اور علمی نقصان ہوا تھا، اُس سے جو خلا، پیدا ہوا، وہ پھر پُر نہ ہو سکا۔ اور بدقسمتی یہ ہوئی کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، یہ خلا، زیادہ ہوتا گیا۔ اسلامی دنیا خود اپنے ماضی کے فکری، علمی، تہذیبی اور فنی روایات سے دُور ہوتی گئی اور آہستہ آہستہ وہ سارے سرچشمے خشک ہوتے گئے، جنہوں نے ایک زمانے میں ملّتِ اسلامیہ کو ایک عظیم ملّت اور اس کی تہذیب کو ایک عالمی تہذیب بنایا تھا۔

غرض تیرھویں صدی عیسوی سے مسلمانوں کے ہاں جو تہذیبی، علمی و ذہنی زوال شروع ہوا، وہ ہماری زندگی کے ہر شعبے پر مستولی ہوتا گیا۔ یہ زوال ہمہ گیر بھی تھا اور سریع السیر بھی، ایک

طرف اسلامی دنیا کی یہ حالت تھی، اور دوسری طرف سولہویں صدی کی ابتدا میں یورپ کے ملاح سمندروں کو پار کر کے امریکہ پہنچے، اور انہوں نے ہندوستان، انڈونیشیا اور چین کا سمندری راستہ بھی دریافت کر لیا۔ اہلِ یورپ نے ان مہموں سے دولت بھی حاصل کی اور اس کے ساتھ ساتھ اُن کے دماغ کے دریچے بھی کھلتے گئے، اُن کے ہاں علوم و فنون کو بڑی ترقی ہوئی اور اس کے ساتھ وہ تجارت اور صنعت میں آگے بڑھتے گئے۔ انیسویں بیسویں صدی میں یورپ نہ صرف سائنس اور ٹیکنالوجی میں، بلکہ علوم و افکار میں بھی جس معراج پر پہنچا ہے، وہ ایک ٹھوس حقیقت ہے، جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

ظاہر ہے ہم ترقی کی اِس دَوڑ میں یورپ سے پیچھے نہیں رہ سکتے، کیوں کہ پیچھے رہنے کے معنی یورپ کو سیاسی و اقتصادی اور تہذیبی و ذہنی ہر دو لحاظ سے اپنے اوپر مسلط کرنا ہے۔ لیکن یہ مقصد دوسری قوموں کی نقالی سے کبھی حاصل نہیں ہوا کرتا۔ اس کے لئے ضرورت ہوتی ہے کہ خود قوم کے اندر سے ذہنی صلاحیتیں اُبھریں اور اس کے اپنے فکری سوتے پھوٹیں، جو اُس کی تاریخی شخصیت کے لوازم ہوتے ہیں۔

اب اگر ہمیں ایک طرف یورپ کے علوم و فنون کو اخذ کرنا ہے، تو دوسری طرف اُس خلا کو بھی بھرنا ہے، جو ہماری آج کی زندگی اور اُس ملّی زندگی میں ہے، جس کی ابتدا عہدِ نبوی سے ہوئی اور پانچ چھ سو سال کی مدت میں وہ ہر شعبے میں کمال کو پہنچی۔ اس خلا کو بھرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہمارا ذہن اُس دَور کی ملّی زندگی سے براہِ راست اتصال پیدا کرے، اور زوال کی ان صدیوں کی خلیج کو اپنی علمی و فکری زندگی میں حائل نہ ہونے دے۔

ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اپنی جملہ کوتاہیوں کے باوجود اسی نصب العین کے لئے کوشاں ہے اور اس کا یہ یقین ہے کہ جب تک ہمارے ہاں وہ دینی، فکری، علمی، تہذیبی اور فنی روح بیدار نہیں ہوگی، جس نے ایک زمانے میں مسلمانوں کے ہاں زندگی کے ہر شعبے میں اعاظم رجال پیدا کئے، اُس وقت تک نہ ہم صحیح معنوں میں جدید علوم اپنا سکیں گے اور نہ اسلام کے عہدِ اقبال کی تجدید کر پائیں گے۔

قدامت اور تجدد میں کشمکش تو تاریخ کے ہر دور میں رہی ہے۔ اور اگر ہمارے علمائے کرام

ہر نئی تحقیق، ہر نئے خیال، ہر نئی تجویز اور ہر نئے اقدام پر برہم ہوتے ہیں، تو یہ بہت حد تک فطری ہے۔ اُمید واثق یہ ہے کہ جدید علوم کے حامل جب قدیم علوم پڑھیں گے۔ اور قدیم علوم پڑھنے والے ایک گونہ جدید علوم میں دسترس حاصل کرلیں گے، تو قدامت اور تجدد کا اِتنا بُعد نہیں رہے گا۔ اور ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے بارے میں علمائے کرام کے جذبات میں اس وقت جو اس قدر تلخی ہے، وہ کافی کم ہو جائے گی۔

کوئی ایک سو سال پہلے انگریزی زبان کی تعلیم، ساٹھ ستر سال پہلے یورپی آدابِ اکل وشُرب اور یورپی لباس پہننے اور تیس چالیس سال پہلے آسمان موجود ہے یا نہیں، کے متعلق ہمارے ہاں جو بحثیں بڑے زور شور سے ہوتی تھیں، اب وہ کہاں سننے میں آتی ہیں۔ اسی طرح آج بعض تحقیقات وتجاویز کے بارے میں جو ہنگامہ کارزار گرم ہے، وہ بھی انشاء اللہ آگے چل کر قدرے ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اور افراط وتفریط سے ہٹ کر بیچ کی ایک راہِ عمل نکل آئے گی، جس پر ملّت کا کارواں جادہ پیما ہو سکے گا۔

قدامت اور تجدد کی موجودہ کش مکش کی شدت تو خدا نے کیا، آئندہ چند سال ہی میں کافی کم ہو جائے گی۔ جس سرعت سے اور وسیع پیمانے پر ہمارے ہاں صنعتی تعمیر ہو رہی ہے۔ لازمی طور پر اُس کے معاشرے پر دُور رس اثرات پڑیں گے۔ اور پھر قدامت بدلتی ہوئی اور آگے بڑھتی ہوئی زندگی کی راہ میں زیادہ حائل نہیں ہو سکے گی۔ ہمارے ہاں صنعتی انقلاب آئے گا اور اپنے ساتھ یقیناً اپنے بنیادی لوازم بھی لائے گا۔

لیکن اس سلسلے میں جس بات کا سب سے زیادہ ڈر ہے۔ وہ خود ہماری قدامت کا باہمی تفرقہ اور اُس کی آپس کی منافرت ہے۔ اور اگر مختلف فرقوں اور مسلکوں سے تعلق رکھنے والے ہمارے علمائے کرام اسی طرح باہم لڑتے رہے جس طرح وہ آجکل لڑ رہے ہیں۔ اور اُن کے منبر، وعظ وارشاد کی مندیں، مساجد ومدارس اور رسائل وتصانیف ایسے ہی مذہبی فرقہ واریت کو ہوا دینے کے لئے وقف رہے، تو اس سے علمائے کرام کے خود وجود اور اُن کے مفادات کو تو نقصان پہنچے گا ہی لیکن اس کی وجہ سے تجدد کو بھی نقصان ہو گا، کیوں کہ تجدد اپنی جبلت میں انتہا پسند ہوتا ہے، اور

یہ قدامت ہی کی قوت ہوتی ہے، جو اس کے لئے "بریک" کا کام کرتی ہے، اُسے حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتی، اور اس طرح قوم میں لامحالہ اعتدال پیدا ہو جاتا ہے ——— اب جب خود قدامت باہم دست و گریباں ہو گی، اور آپس کی لڑائی کی وجہ سے وہ لوگوں کے سامنے سرتاپا شر ہی کی شکل میں آئے گی۔ تو معاشرے میں اُس کا کیا وقار رہے گا، اور تجدد خواہوں پر اُس کا اخلاقی دباؤ کہاں تک مؤثر ہو سکے گا۔

اکثر و بیشتر تمام مسلمان ملکوں میں اسلامی فرقوں کی اس مذہبی و نظریاتی نزاع کو جو صدیوں سے اُن کے ہاں چلی آتی تھی، ختم کر دیا گیا ہے۔ سعودی حکمرانوں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُن کے عہد میں کعبہ مکرمہ میں چار مذاہب فقہ کے الگ الگ مصلّے نہیں رہے، جہاں کہ مالکی، شافعی، حنبلی اور حنفی امام روزانہ الگ الگ پنج وقتہ نمازیں پڑھایا کرتے تھے۔ اب بیت الحرام میں ایک ہی مصلّے ہے، اور سب نمازی ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ مصر میں چاروں مذاہب کے مکاتبِ فقہ کو یکجا مدوّن کیا جا رہا ہے۔ اور اب تو فقہ زیدی کے ساتھ فقہ اثنا عشری کو بھی شاملِ نصاب کر لیا گیا ہے، حال ہی میں برصغیر کے بوہرہ فرقہ کے چند طالب علم جامعہ ازہر میں داخل ہوئے ہیں اور ازہری طالب علم بوہروں کی درس گاہوں میں تعلیم کے لئے بھیجے گئے ہیں۔

مصر میں مسلمانوں کے مختلف فکری و مذہبی مکاتب کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی بڑی مستعدی سے کوششیں ہو رہی ہیں، کیونکہ آنے والے خطرات میں جن کا سیلاب بڑے زور سے اُمڈا چلا آ رہا ہے، ایک مسلمان قوم کے لئے بحیثیت ایک مسلمان قوم کے جس کی کہ اپنی مستقل شخصیت ہو، باقی رہنے کی یہی ایک صورت ہے کہ وہ خود ایک فکری، تاریخی و روایتی وحدت ہو۔ اور آپس میں ذہنی طور پر متحارب گروہوں میں بٹی ہوئی نہ ہو۔

معلوم نہیں، ہمارے علمائے کرام کو اس کا کب احساس ہوتا ہے۔ لیکن فرض کیا اگر وہ ان خطرات کو محسوس نہیں کرتے تو کیا ہماری حکومت کا یہ فرض نہیں کہ وہ اس طرف توجہ کرے کیونکہ یہ مسئلہ محض مذہب کا نہیں کہ علمائے کرام اس میں کسی کی مداخلت برداشت نہ کریں۔ یہ مسئلہ پاکستان کے استحکام، اُس کے دفاع اور اُس کی تعمیر و ترقی سے تعلق رکھتا ہے، اگر ہمارے مذہبی گروہوں کی یہ فرقہ وارانہ سرگرمیاں اسی طرح جاری رہیں تو ان کی زد لازماً اس ملک اور اس ملت پر پڑے گی۔ ان مذہبی تفرقہ انگیزیوں کا سدِّباب ہونا چاہیئے۔ کیا ہماری حکومت اس بارے میں کوئی مثبت قدم اُٹھائے گی۔